Vol. 7 No.1 2024

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7615

مولانا محمد علی جوہر بطور سیاسی و مزاحمتی شاعر[1]

☆ڈاکٹر حمیرا اکرم

☆☆ڈاکٹر محمد عبیداللہ

☆☆☆حافظ محمد ثاقب

Abstract

Poetry that resists power structures and questions social, political, economic or religious norms set by powerful institutions, is often known as resistant poetry. Resistant poetry questions/ challenges the established norms and ideologies at a place. Resistant poetry often addresses issues of social, political and economic injustice or inequality. Resistant poetry is considered as powerful medium for expressing dissent and leftist view to advocate change. Resistance in literature facilitates the expression of marginalized voices and serves as an effective platform for alternate narrative. Moreover, resistance in literature is necessary as it serves as powerful medium for expressing dissent, nurturing of critical thinking and resultantly contribute in ideological, social, cultural change. Term of Resistant literature in not only confined to Poetry but it is also employed in other genres of literature very effectively like short story, novel, plays, columns and essays but in poetry it is used more efficiently particularly in Urdu Ghazal due to its symbolism and enigma which serves the purpose more effectively. During freedom movement of Pakistan, resistant poetry has been used as an effective tool to express narrative of oppressed and subjugated people of subcontinent. Voice of Maolana Muhammad Ali Jaohar was one of the strongest and effective voice among resistant poets of subcontinent.

کلیدی الفاظ: مزاحمت(Resistance)، غاصب(Oppressor)، مدافعت(Defense)، بیاری تناظر(Leftist view)، مقتدر طبقہ(Ruling Class)، استعمار کار(Colonizer)، زیرِ استعمار(Colonized)، آمر(Dictator)

مزاحمت عربی لفظ ''زحم''/ ''زحمہ'' سے مشتق ہے جس کے معنی حریف سے ٹکرانے بھڑانے، دبانے یا مدافعت کے ہیں۔ مزاحمت کسی ناگوار عمل کے خلاف قولی، فعلی، تاثراتی یا ذہنی ردِ عمل کا نام ہے اور یہ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ انسانی سرشت میں مزاحمت کے جذبے کا پہلا اظہار اُس لمحے ہی ہو گیا تھا جب شیطان کی ترغیب پر وہ شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے یا نہ جانے کی کشمکش کا شکار ہوا تھا۔ یہ ابتدائی مزاحمت بنی نوعِ انسان کے نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ کی صورت آج دن تک جاری و ساری ہے۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ یہاں ہمیشہ مضبوط اقوام نے کمزور اقوام پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا؛ ترقی یافتہ اقوام نے اپنے جدید ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی کے زور پر ترقی پزیر قوموں پر غلبہ حاصل کیا اور پھر اُن کا لسانی، تاریخی،

☆اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ دبئی محل کالج بہاول پور

☆☆اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول نگر کیمپس

☆☆☆پی۔ایچ ڈی سکالر، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

جسمانی، مالی اور سب سے بڑھ کر ثقافتی استحصال کیا۔ ہر معاشرے میں طاقت ور طبقے نے کمزور طبقے کو اپنا دستِ نگر اور غلام ہی بنا کر رکھا۔ دوسری طرف یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جبر اور مزاحمت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں جبر ہو گا وہاں مزاحمت بھی ضرور ہو گی۔ لہٰذا خیر و شر کا یہ باہمی پیکار، انسان کا اپنے نفس کے خلاف جہاد، سچائی کا کذب کے سامنے سینہ سپر ہو جانا، سچ کا جھوٹ کے آگے ڈٹ جانا، کمزور کا طاقت ور کے سامنے احتجاج، خواہ وہ زیرِ لب ہو یا بالائے لب، مزاحمت ہی کی صورتیں ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ خواہ کتنا ہی جبر، پابندی، قدغنیں اور کتنی ہی تعزیریں کیوں نہ ہوں؛ ایک حقیقی تخلیق کار اِس کیفیت کے خلاف آواز اٹھانے میں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے خواہ اُس کا حشر، چلی کے پابلو نرودا، ترکی کے ناظم حکمت، فلسطین کے محمود درویش، جرمنی کے ہائینے، برصغیر کے جعفر زٹلی، حسرت موہانی، حسن ناصر، فیض احمد فیض، حبیب جالب اور احمد فراز جیسا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

ڈاکٹر رشید امجد مزاحمتی ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> عمومی معنوں میں ادب ہوتا ہی مزاحمتی ہے کہ ادیب موجودہ صورتِ حال اِس کے جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔[1]

جب ژاں پال سارتر یہ کہتا ہے کہ ''ادیب کا قلم اُس کا ہتھیار ہے'' تو وہ دراصل ہر ادب کو مزاحمتی ادب ہی قرار دے رہا ہوتا ہے۔ جب ادیب زمانے کے جبر، نظام کی سفاکیت، عوام الناس کی بے چینی اور بے بسی کو دیکھ کر پیچ و تاب کھا کر قلم اٹھاتا ہے تو اُس کی آواز ہر عہد کی سچائی کی آواز سے ہم ہو کر مزاحمتی ادب تخلیق کرتی ہے۔ ایسا ادیب کبھی موت کو گلے لگاتے ہوئے ''اور روشنی، مزید روشنی'' کا نعرہ لگاتا ہوا سقراط کا نغمہ بن جاتا ہے تو کبھی نعرۂ اناالحق بن کر حسین بن منصور حلاج کی تغنیاتِ حمدِ باری بنتا ہے۔ لیکن یہاں یہ امرِ ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ مزاحمتی ادیب کے لیے بھی میانہ روی کے اصول کی پاسداری لازمی ہے ورنہ مزاحمت کا دانش ورانہ رویہ چیخ بن جانے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ مزاحمت کا بیانیہ چیخ بن جائے تو ادب محض نعرے بازی رہ جاتی جو اثر آفرینی سے خالی رہتی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس کے بقول:

> ادب کی تخلیق اور محرکات کے بارے میں فلسفے اور نظریے اپنی جگہ لیکن ادب کی تاریخ اور عملی اطلاق پر نظر ڈالیے تو اِس حقیقت سے انکار مشکل ہو گا کہ ادب کا ایک قوی محرک اختلاف اور انحراف DISSENT کا جذبہ بھی ہے[2]۔

مزاحمتی ادب اور بالخصوص شاعری تمام استعمار زدوں کی سانجھی آواز ہے۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ مزاحمتی ادب برصغیر میں تخلیق ہونے والے ہر زبان کے ادب کی گھٹی میں شامل ہے؛ تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ مزاحمتی ادب ہی تھا جس نے جوش ملیح آبادی، مولانا حسرت موہانی، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، علامہ محمد اقبال، صادق سیالکوٹی، مجید امجد، فیض احمد فیض، احسان دانش اور حبیب جالب۔۔۔۔ جیسے شعرا پیدا کیے جنھوں نے عوامی امنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے آوازِ حق بلند کی اور مظلوم انسانیت کی نصرت کا فریضہ انجام دیا۔ سورہ شعرا میں بھی ایسے شعرا کی تعریف کی گئی ہے جو اپنی شاعری کو اللہ کی حمد کے لیے اور مظلوم ہونے کی صورت میں مزاحمتی بیانیے کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں[3]۔

شعرا کے اِسی مزاحمتی قبیلے سے تعلق رکھنے والا برصغیر کا ایک اہم نام مولانا محمد علی جوہر (1878ء تا 1931ء) کا بھی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر ممتاز سیاست دان، ادیب، شاعر اور صحافی تھے جو 10 دسمبر 1878ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر کے دادا علی بخش نے ہنگامۂ غدر 1857ء میں ایک انگریز کی جان بچائی تھی جس کے صلے انھیں مراد آباد میں ایک جاگیر بھی عطا ہوئی تھی۔ مولانا کے والد کا نام عبدالعلی تھا جن کی ساری زندگی نواب یوسف علی خان کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوئی۔ مولانا کی والدہ کا نام آبادی بانو بیگم تھا جو بی اماں کے نام سے مشہور تھیں۔ مولانا کے علاوہ آبادی بیگم کے اور بیٹے مولانا شوکت علی اور ذوالفقار گوہر بھی تھے۔ مولانا محمد علی نے 1899ء میں علی گڑھ سے

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

بی۔اے کیا۔میر محفوظ علی جو مولانا کے علی گڑھ میں گزرے شب و روز کے شاہد تھے، نے اُن کے بارے میں یہ رائے دی۔

''محمد علی قابل رشک اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سنتے فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے [4] ''

سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر کے مختصر مجموعے میں کوئی شعر ایسا نہیں جس کا مفہوم یا شان نزول یا جس کا سیاسی، وارداتی عقائد یا واقعاتی ماخذ یا تلمیحاتی اور اشاراتی رنگ جوہر کی نثر یا ان کے سوانح حیات نے واضح نہ کر دیا ہو۔ادبیات عالم میں کم ایسا ہوا ہو گا کہ کسی شاعر کے اشعار نہ صرف شاعر بلکہ ایک پوری قوم اور ملت کی آپ بیتی کا اس طرح مرقع بن گئے ہوں کہ اس سے اس دور کی تاریخ اور جنگ آزادی کی روداد مرتب کی جا سکے اور طرز وہ یہ کہ شعر بیت پر آنچ نہ آئے۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

مولانا محمد علی جوہر کا مزاج سر سید احمد خان کی رہنمائی میں تشکیل پایا تھا،اِس لیے اُن میں مفاہمت، مقصد کی لگن اور آزادی کی سچی تڑپ موجود تھی۔انھوں نے ہمیشہ اپنی صحافت اور شاعری کے ذریعے انگریزی استعمار کو چیلنج کیا۔غلامی اُن کے نزدیک کفر کے برابر ہے۔

بت پرستی کا نشاں، طوقِ غلامی کم ہے
کیا ضروری ہے کہ قشقہ بھی ہو زنار بھی ہو

کربلا کا لفظ یا یہ مکمل سانحۂ فاجعہ ہی ایک مزاحمتی جدوجہد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ حسینؓ نے سر دے دیا لیکن اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ نہیں کیا۔کم و بیش ہر شاعر نے کربلا کے استعارے سے مزاحمت کے بیانیے کو تقویت دی ہے؛احمد فراز نے کہا تھا:

جب بھی ضمیر و ظرف کا سودا ہو دوستو
زندہ رہو، حسین کے انکار کی طرح

اردو شاعری میں کربلا کا لفظ ایک جغرافیائی مقام،ایک تاریخی واقعہ یا ایک سانحہ ہی نہیں رہا بلکہ مزاحمت کا استعارہ بن کر سامنے آیا ہے۔کم و بیش ہر شاعر نے ہی کسی نہ کسی شکل میں واقعہ کربلا کے استعارے کو معرکۂ حق و باطل اور کشمکشِ خیر و شر کے تناظر میں استعمال کیا ہے۔مولانا محمد علی جوہر نے بھی اپنی مزاحمتی شاعری کے لیے کربلا کے استعارے کو بڑے بلیغ معنوں میں استعمال کیا ہے

بے تاب کر رہی ہے تمنائے کربلا
یاد آرہا ہے بادہ و پیمانِ کربلا
ہے مقتلِ حسین کی اب تک وہی بہار
ہیں جس قدر شگفتہ یہ گلہائے کربلا[5]

کربلا کے تناظر میں مولانا محمد علی جوہر کے یہ اشعار بالخصوص پہلا شعر تو ایک آفاقی مزاحمتی بیانیہ اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
ستم سے کچھ نہ ہوا،اب کھلا ستم گر پر
ابھی کچھ اور بھی باقی ہے قتلِ عام کے بعد[6]

اِس شعر میں دراصل دو عالمگیری قوانینِ فطرت بیان کیے گئے ہیں۔پہلا یہ کہ ظالم کا حد سے بڑھا ہوا جور و ستم دراصل ظالم کی موت کا اشاریہ ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ جتنا بڑا مقصد ہو گا اُس کے لیے اتنی ہی بڑی قربانی دینا ہو گی۔اسلام کے احیائے نو کے لیے قربانی بھی کربلا برپا کر کے دینا پڑے گی۔کتابِ حکمت قرآنِ کریم میں بھی فطرت کے اِسی اصول کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کے صرف اس دعوے پر کہ ہم ایمان لائے ہیں ہم انہیں بغیر آزمائے ہوئے ہی چھوڑ دیں گے ؟(العنکبوت02)

لیکن جب کوئی قوم آزمائش پر پورا اترتی ہے تو اُس کے لیے عیشِ دوام ہے؛آسانیاں ہی آسانیاں ہیں؛بے شک تنگی کے بعد آسانی ہے۔ تنگی کے بعد آسانی کا یہ قانونِ الٰہی یاد دلا کر مولانا محمد علی جوہر مجبور و مقہور لوگوں کو امیدِ نو دیتے ہیں۔وہ تاریخِ اسلام کا حوالہ دیتے ہوئے یاد دلاتے ہیں ساری تاریخِ اسلامی اِس امر کی شاہد ہے کہ جب جب مسلمانوں نے خود کو آزمائشوں میں ڈالا، تحقیق، تخلیق اور جہاد میں ریاضتیں کیں، مشکلات کی اٹھائیں تب تب مسلمانوں کو آسانیاں ملیں، سروری نصیب ہوئی۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

اے مسلماں تو تو مسجودِ ملائک تھا کبھی
پھر یہ شیطاں کی غلامی کیوں تری تقدیر ہے
کیا نہیں واقف ابھی اسلام کی تاریخ سے
ان مع العسر یسرا ہی کی سب تفسیر ہے[7]

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

"۔۔۔اُن کی زیادہ تر کامیاب شاعری میں سیاسی موضوعات کو مذہبی استعاروں میں یا مذہبی موضوعات کو سیاسی استعاروں میں بیان کیا گیا ہے[8]"

فرصت کسے خوشامدِ شمر و یزید کی
اب ادعائے پیروئ پنج تن کہاں
پیغام ملا تھا جو حسین ابنِ علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
خود خضر کو شبیر کی تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے[9]

مولانا محمد علی جوہر انگریزی استعمار کے سخت خلاف تھے۔ اُنھیں انگریزی سرکار کے خلاف اپنی تحاریر و تقاریر کی بنا پر کئی بار قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ نظر بندی کے ڈھائی سال بعد مولانا کو جب آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تو انھوں نے کہا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہرؔ
لیکن صلہ روز جزا اور ہی کچھ ہے 10

خلافت کمیٹی کے اجلاس میں مولانا نے انگریز استعمار کو للکارتے ہوئے کہا تھا کہ حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کی ہے۔ قانونِ الٰہی کو ہر قانون پر برتری حاصل ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ ایک طرح سے انگریز کے خلاف کھلی بغاوت تھے لہٰذا انگریز حکومت نے مقدمہ چلایا اور دو سال کے لیے مولانا کو قید کر دیا۔ 13 اپریل 1919ء کو جلیاں والا قتلِ عام کے کے بعد جب حالات زیادہ خراب ہو گئے تو سیاسی قیدیوں کی عام معافی کے بعد مولانا کو بھی رہائی ملی۔ رہائی کے موقع پر استعماری غلامی سے اپنی بیزاری کا اظہار انھوں نے اِن الفاظ میں کیا۔

> میں انگریزی حکوت سے بیزار ہوں میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے ہندوؤں کی غلامی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو اسے قبول کر لوں گا میں[11]"

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

مولانا کے مزاج میں آزادی کی تڑپ اور استعماری آقاؤں سے نفرت اُن کی صحافت اور شاعری دونوں میں نظر آتی ہے۔

دو برس کی قید ہے کیا قید ہے قیدِ وفا
خاتمہ یارب نہ ہو اس قید بے معیاد کا
فصل گل تو ان کی ہے جو جور گل چیں سہہ سکیں
پھر جنون عشق ہم کو سوئے زنداں لے چلا[12]

عمومی تاثر ہے کہ مولانا کی مذہبی شاعری اُن کی سیاسی شاعری سے بہتر ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اُن کی سیاسی شاعر ہو یا مذہبی جب جب وہ مذاحمتی رنگ اختیار کرتی ہے تب تب اُن کی شاعری ایک منفرد رنگ جماتی نظر آتی ہے۔ وہ ایک متحرک سیاسی رہنما، بے باک صحافی اور آزادی کے مجاہد تھے جن کا مزاج سیماب وشی، بے قراری، بے چینی اور مزاحمت سے عبارت تھا۔ اس لیے اُن کی شاعری میں جہاں جہاں حرکت، مزاحمت، بے چینی، مزاحمت، حبس، برداشت، جبر، زنداں، قید، تیغ، خون وغیرہ کے پر شور استعاروں اور پیکروں سے آراستہ نظر آتی ہے وہاں وہاں وہ فنی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ملتی ہے۔

گراں ہو اب تو شاید سیرِ گل بھی
کچھ ایسے ہو گئے خو گر قفس کے
ملی ہے قید آزادی کی خاطر
نہ پڑ جائیں کہیں دونوں کے چسکے[13]
ہم کو خود شوقِ شہادت ہے گواہی کیسی
فیصلہ کر بھی چکو مجرمِ اقراری کا[14]

مولانا محمد علی جوہر ایک مزاحمت میں جارحیت، تشدد اور تصادم کی بجائے عدم جارحیت اور برداشت کے قائل تھے۔ اِس ضمن میں وہ گاندھی کے **'اہنسا'** کے نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اہنسا کا نظریہ بنیادی طور پر جین مت اور بدھ مت سے ماخوذ ہے لیکن گاندھی جی نے پہلی مرتبہ اِسے سیاسی فلسفے کے طور پر اپنایا اور ستہ گرہ، تمسک بالحق یا سچ کی قوت کو بطور سیاسی حکمتِ عملی استعمال کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے گاندھی جی کی تحریک ترکِ موالات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اِسی تحریک کے دوران میں انھوں نے 1920ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا جس کی بنیاد گاندھی جی کے عدم تشدد کے آدرشوں پر ہی رکھی گئی تھی۔ اِس ادارے میں بچوں کو اِسی نہج پر تعلیم دی جاتی تھی حتیٰ کہ لباس بھی کھدر کا پہنایا جاتا تھا۔ اُن کا ذہن اِس حوالے سے بہت صاف تھا کہ مسلمانوں کو اپنی بچی کھچی طاقت تشدد اور جارحیت کی راہ پر چل کر ضائع کرنے کی بجائے اِسے اپنے نظریے کی ترویج اور سیاسی و معاشی استحکام حاصل کرنے میں لگانی چاہیے۔ تشدد کا راستہ اختیار کرنا اپنی توانائیوں کا زیاں ہے۔ لیکن دوسری طرف اِس کے ساتھ ساتھ حکمران استعمار کے سامنے اپنے مطالبات پوری شد و مد سے رکھنے چاہیں تاکہ ہندو کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تحفظات بھی اُن کے پیشِ نظر رہیں۔ یہی عدم تشدد کی پالیسی اور جمہوری و قانونی جدوجہد قائدِ اعظم محمد علی جناح کا بھی منشور تھا۔

دو برس کی قید کیا ہے، قید ہے قیدِ وفا
خاتمہ یارب نہ ہو اِس قیدِ بے میعاد کا
فصلِ گل تو اُس کی ہے جو جورِ گل چیں سہہ سکیں
پھر جنونِ عشق ہم کو سوئے گل چیں لے چلا[15]

اِس کائنات کا نظام مزاحمت و جدلیات سے عبارت ہے۔ چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ نظریات ہوں، اشیاء ہوں یا انواع وہ باہمی جدل سے رفتہ رفتہ اپنی ارتقائی معراج کو

پہنچتی ہیں۔اگر فطرت کی مزاحم قوتیں موجود نہ ہوں تو اشیاءوانواع اپنی ارتقائی سیڑھی پر گامزن ہو کر ارفع منزل پر فائز ہی نہ ہو سکیں۔مولانا کے نزدیک افراد ہوں یا اقوام، اگر اُن کے پیشِ نظر عظیم اہداف اور اِن اہداف کے حصول کے لیے رکاوٹیں نہ ہوں تو اُس قوم کی صلاحیتوں میں اضافہ ممکن نہیں۔مزاحم قوتوں کی ستیزہ کاری کے بغیر قومیں جمود کا شکار ہو کر معدومی کے خطرے سے دوچار ہو جاتی ہیں۔اِس تناظر میں دیکھا جائے تو جبر کی قوتیں یا تندیٔ بادِ مخالف، افراد کی دن بہ دن اونچی اڑان کے لیے ضروری بھی ہیں یعنی ''ایک نعمت بھی یہی ایک قیامت بھی یہی''۔یہ نظریہ مولانا محمد علی جوہر نے کربلا کے تناظر میں یوں بیان کیا ہے:

دینا تھی دادِ تشنہ لبی یوں حسین کو

کوثر کا اک بہانہ بنی کربلائے دو سب[16]

یہ اصلِ اصولِ کائنات ہے کہ فطرت کبھی ظالم نہیں ہو سکتی لیکن اگر ہم فطرت کے خلاف چلیں گے تو یقیناً فطرت انتقام بھی لیتی ہے۔مولانا کی شاعری میں فطرت ایک استعارہ کے طور پر آئی ہے۔کہیں تو فطرت کا لفظ قوانینِ فطرت یا کائنات کے عالمگیر اصولوں کے لیے استعمال ہوا ہے تو کہیں اِس سے مراد مشیتِ الٰہی ہے۔جب آپ مشیتِ الٰہی کے خلاف چلیں گے تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مکر خیرُ الماکرین سے ہے عبث

اپنی چال اور آپ ہی کو مات ہے[17]

فطرت کبھی خلق پر ظلم نہیں کرتی۔فطرت کے نزدیک ظالم و مظلوم، جابر و مجبور کے درمیان مقابلہ محض ایک تماشا نہیں ہے بلکہ اِس کشاکش سے فطرت کو افراد کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ جہد للبقا میں کون زیادہ سرگرم ہوتا ہے۔وہ افراد کی لغزشوں سے اغماض بھی کر سکتی ہے لیکن اگر افراد من حیث القوم جہد للبقاء سے کنارہ کش ہو جائیں تو فطرت انھیں کبھی معاف نہیں کرتی۔اقبالؒ نے فرمایا تھا:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے

نہیں کرتی ہے کبھی ملت کے گناہوں کے معاف

خیر و شر کی ستیزہ کاری کے پیچھے کار فرما دوسرا اہم مقصد افراد کی صلاحیتوں کی جانچ اور اُن کی خفتہ صلاحیتوں کی بیداری بھی ہوتا ہے۔مولانا کے نزدیک مغلوب قوم دراصل مراحلِ تربیت سے گزر رہی ہوتی ہے۔اگر وہ دورِ ابتلا میں سیکھنے کی کوشش کرے تو تاریخ کا گردشی چکر انھیں غالب کر دیتا ہے۔اگر معاملہ اِس کے برعکس ہو تو فطرت ایسی قوم کو حرفِ غلط کی طرح مٹا بھی دیتی ہے۔فطرت کے اِسی رویے کی جانب مولانا محمد علی جوہر اشارہ کرتے ہوئے اپنے لوگوں کو یاسیت سے نکالتے ہیں اور نویدِ امید دیتے ہیں۔

کیوں فکر ہو کیا اپنے کبھی دن نہ پھریں گے

بے کار ہے پھر گردشِ دوراں کی شکایت[18]

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد

ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد[19]

مولانا کی شاعری میں مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے، قوتِ برداشت کا مظاہر کرنے اور پورے بانکپن سے سوئے دار کھنچے چلے جانے کا پیغام ملتا ہے۔وہ ظلم کا ظلم و تشدد سے مقابلے کرنے کا نہیں بلکہ ضبطِ نفس سے مقابلہ کرنے کا درس دیتے ہیں۔

تو ہو آمادہ جو اے دل تو ہے پھر دار بھی ہیچ

آزما دیکھ یہ سب کھیل ہے تیاری کا[20]

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

غالب نے کہا تھا:

خطر پسند طبعیت کو ساز گار نہیں
وہ آشیاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اہلِ ہمت خطرات سے کھیلتے ہوئے منزل سے ہمکنار ہو جاتے ہیں اور پس ہمت لوگ لبِ دریا کھڑے ہو کر موجوں کی طغیانیوں سے خوف زدہ ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی شاعرانہ فکر میں بھی کچھ اِسی قسم کا مزاحمتی مزاج رچا بسا ہوا ہے۔ وہ خطرات سے دامن بچا کر نکل جانے کی بجائے خطرات کا سامنے کرنے، مشکلات کو غنیمت جانتے ہوئے انھیں برداشت کرنے اور اِن کے ذریعے اپنی خفتہ صلاحتیوں کی تعمیر کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔

آساں پسندیوں سے ہیں بے زار اہل عشق
چھانٹا یہ مرحلہ بھی ہے دشوار دیکھ کر [21]

صحافت و سیاست مولانا کی شخصیت کے وہ نمایاں پہلو ہیں جنھوں نے اُن کا تعارف بطور ایک بڑے شاعر کے بننے ہی نہیں دیا اور نہ وہ شاعری کو کما حقہٗ وقت ہی دے سکے۔ مولانا کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کل وقتی شعرا کی طرح متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے والے اور نئی نئی صورتیں پیدا کرنے والے بڑے شعرا کے درمیان اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ وہ تو ایک بے باک صحافی، بااصول سیاست دان اور آزادی کے مجاہد تھے۔ اُن کی شاعری کا غالب موضوع بھی مذہبی عصبیت کو بروئے کار لاتے ہوئے مزاحمتی تحریک برپا کر کے سیاسی مقاصد کا حصول تھا۔ یہی وہ تاثرِ وحید ہے جو اُن کی شاعری میں شروع سے لے کر آخر تک رچا بسا ملتا ہے۔ یوں اگر وحدتِ تاثر کے حوالے سے دیکھا جائے تو مولانا کو اگر بڑے شعرا کی صف میں جگہ نہ بھی دی جائے تو بھی اُن کے کام سے صرفِ نظر کر آگے گزر جانا ممکن نہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''وحدتِ تاثر کی حد تک وہ شاعری کا حق یقیناً ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سیاست کے میدان میں اپنے نقوشِ قدم اِس قدر نمایاں چھوڑے ہیں کہ باقی اور میدانوں میں انھیں کسی نشان کی ضرورت نہ تھی [22]''

گول میز کانفرنس میں مولانا کی شعلہ آشام تقریر اُن کا آخری مزاحمتی بیانیہ ثابت ہوئی۔ اِس تقریر کی شدت، اثر آفرینی اور شعلہ افشانی کا اندازہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے اِن الفاظ سے ہوتا ہے۔

> ''آخری سفر دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں سفرِ آخرت! بدبینوں نے کہا، کہ اب اِس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہِ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) ''کہ آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اِسی سرزمین پر دے کر''! مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری 1931ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان 1350ھ کو پندرھویں شب میں، عین اُس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے یہ نعمتِ عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی!۔۔۔''[23]۔

لہٰذا ہم یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مزاحمتی و سیاسی شاعری کی صورت میں قوم کے لیے مولانا کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں جو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔

حوالہ و حواشی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615
Vol. 7 No.1 2024

1 ۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب، اردو (1999ء تا 2007ء)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، پاکستان، 2009ء ص 17
2 ۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، مضمون ''اردو ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت'' مشمولہ، اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے رویے، مرتبہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، دہلی، اردو اکادمی 2004ء ص 20
3 ۔ الشعراء 227۔
4 ۔ مولانا عبدالرشید ارشد، ''بیس بڑے مسلمان'' مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور، س۔ن ص 786
5 ۔ علی محمد خاں، ڈاکٹر، کلیاتِ جوہرؔ، ناشران وتاجرانِ کتب، لاہور 1990ء لاہور ص 53
6 ۔ جوہر، مولانا محمد علی، ''کلامِ جوہر'' مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی، دہلی، مکتبہ جامعہ، ص 79
7 ۔ علی محمد خاں، ڈاکٹر، کلیاتِ جوہرؔ، ناشران وتاجرانِ کتب، لاہور 1990ء لاہور ص 102
8 ۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، ''اثبات و نفی''، کراچی، فکشن ہاؤس، 2017ء، ص 111
9 ۔ جوہر، مولانا محمد علی، ''کلامِ جوہر'' مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی، دہلی، مکتبہ جامعہ،، ص 113
10 ۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان،، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ، لاہور، س۔ن، ص 799
11 ۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان،، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ، لاہور، س۔ن، ص 720
12 ۔ علی محمد خاں، ڈاکٹر، کلیاتِ جوہرؔ، ناشران وتاجرانِ کتب، لاہور 1990ء لاہور ص 62
13 ۔ جوہر، مولانا محمد علی، ''کلامِ جوہر'' مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی، دہلی، مکتبہ جامعہ، ص 130
14 ایضاً، ص 71
15 ۔ علی محمد خاں، ڈاکٹر، کلیاتِ جوہرؔ، ناشران وتاجرانِ کتب، لاہور 1990ء لاہور ص 62
16 ۔ ایضاً ص 64
17 ۔ ایضاً ص 94
18 ۔ ایضاً ص 65
19 ۔ ایضاً ص 66
20 ۔ ایضاً ص 61
21 ۔ ایضاً ص 66
22 ۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، ''اثبات و نفی''، کراچی، فکشن ہاؤس، 2017ء، ص 112
23 ۔ جوہر، مولانا محمد علی، ''کلامِ جوہر'' مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی، دہلی، مکتبہ جامعہ، ص 16